سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سلطنتِ عثمانیہ

خالد امین*

بیسویں صدی کے متعدد مسلمان دانش ور یورپی جارحیت کے خلاف زندگی کے ہر دائرہ کار میں نبرد آزما رہے ہیں۔سید ابوالاعلی مودودی (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۹ء) کا شمار بھی ان مسلم دانش وروں میں ہوتا ہے جنھوں نے یورپ کی اس جارحیت کے خلاف ایک سیاسی، تہذیبی اور فکری حکمت عملی تشکیل دینے کے لیے مسلمانوں کو یکجا ہونے کی دعوت دی اور کہا کہ مسلمان اس صدی میں جس تباہی سے دو چار رہے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اتحاد کی قوت کو پارہ پارہ کر چکے ہیں۔فکرِ مودودی کی اس جہت کو ان کی برپا کی جانے والی تحریک جماعت اسلامی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اتحاد اسلام کے داعی ابتدا ہی سے تھے۔انھوں نے نوجوانی کے عالم میں سلطنت عثمانیہ کی قوت کو ختم ہوتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے ان کی یہ کوشش رہی کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو ملت کے تصور سے روشناس کرایا جائے اور انھیں یہ بتایا جائے کہ ان کی اس عظیم الشان اسلامی قوت کا حشر کس سیاسی گٹھ جوڑ کی بنا پر ہوا۔انھوں نے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کامیاب کوشش کی کہ اپنی تباہی پر نالاں ہونے کے بجائے ان محرکات وعوامل سمجھا جائے۔سید مودودی کی ابتدائی سیاسی زندگی کی تشکیل میں تحریک خلافت کے اثرات نمایاں تھے۔اس تحریک کے ابتدائی زمانے میں وہ اخبار تاج کے مدیر تھے جو جبل پور سے نکلتا تھا۔اس دوران مولانا نے جبل پور میں تحریک خلافت کو فعال کیا اور اس کے جلسوں میں تقریریں کیں [۱]۔

سلطنت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کے لیے یورپی قوتوں نے پہلا الزام یہ لگایا کہ عثمانوی عمل داری میں موجود اقلیتیں غیر محفوظ تھیں۔خصوصاً شورش آرمینیا [۲] کا الزام لگا کر یورپ میں جھوٹے قصے اور افسانے گھڑے گئے اور ترکوں کے خلاف یورپی قوتوں کو صف آرا ہونے کی تلقین کی گئی۔یورپی قوتوں نے حقائق کی چھان پھٹک کرنے کے بجائے ان غلط بیانیوں پر ایمان رکھتے ہوئے کہا کہ ترکی میں عیسائی انسانی حقوق سے محروم ہیں اور عہد رومی کی طرح غلامی کی حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ان الزامات کو پروان چڑھانے کا مقصد یہ تھا کہ یورپی قوتوں کو ترکی میں مداخلت کرنے کا جواز فراہم کیا جائے۔مگر جب اہل یورپ کو مقدونیہ اور کریٹ (اقریطش) میں ترکوں کی حالت زار کی جانب

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، کراچی یونی ورسٹی، کراچی

توجہ دلائی جاتی تھی تو وہ ان حقائق سے منہ موڑ لیتے تھے۔موجودہ صدی میں یورپ اور امریکا نے عراق میں جس انداز سے جھوٹے الزام لگا کر پورے مشرق وسطی کو آگ میں جھونک دیا ہے یہ اسی جھوٹ کے تسلسل کا ایک حصہ ہے جسے یورپ کے کار پرداز ان سیاست دور استعمار سے آزمارہے ہیں۔

خلافت عثمانیہ پر لگائے گئے ان الزامات کا جواب ہندوستانی مسلم دانش وروں نے بھرپور انداز میں دیا تھا۔سید مودودی نے بھی اس حوالے سے دو اہم کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ان میں پہلی کتاب سمرنا میں یونانی مظالم[۳] (Greek Atrocities in the vilayet of Smyrna) ہے جب کہ دوسری ترکی میں عیسائیوں کی حالت ہے۔تذکرہ سید مودودی میں رفیع الدین ہاشمی صاحب نے لکھا ہے کہ انھوں نے ترکی میں عیسائیوں کی حالت کے بارے میں سید مودودی سے استفسار کیا تو ان کا کہنا تھا کہ یہ کتاب کسی ایک کتاب یا رسالے کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مختلف کتابوں، رسائل اور اخبارات سے متفرق تحریریں لے کر ان کا ترجمہ اس رسالے میں جمع کر دیا گیا تھا[۴]۔

یہ دونوں کتابیں دارالاشاعت سیاسیات مشرقیہ دہلی سے شائع ہوئی تھیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے لکھا ہے کہ مولانا نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز جن کتابوں کے تراجم سے کیا ان میں پہلی کتاب سمرنا میں یونانی مظالم تھی[۵]۔تحریک خلافت اور مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۱ء) سے سید مودودی کو ایک گونہ لگاؤ تھا۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سید محمد جعفری صاحب نے تحریک خلافت کے حوالے سے شوکت علی اور محمد علی کے نام سے مجموعہ علی برادران مرتب کیا تو اس کے لیے جن حضرات سے مقالات لکھوائے ان میں سید مودودی بھی شامل تھے[۶]۔

سید محمد جعفری کی مرتبہ علی برادران سے قطع نظر سید مودودی نے محمد سرور کی کتاب مضامین محمد علی (حصہ اول) پر جوہر کی شخصیت پر جو تبصرہ کیا تھا اس سے ان کی عقیدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس مختصر سی تحریر میں انھوں نے محمد علی جوہر کی فکری بصیرت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی تھی اور کہا کہ جوہر کی شخصیت سے اسلام اپنی اصلی صورت میں نظر آنے لگا تھا۔مگر ہندوستان میں انھوں نے جس مسلم قومیت کو پیدا کرنے کی کوشش کی وہ ترقی کر کے مسلم قوم پرستی میں تبدیل ہوگئی[۷]۔

محمد علی جوہر کی خودنوشت سوانح عمری *My life: A Fragment* کے بارے میں سید مودودی نے لکھا کہ جوہرؔ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہتے تھے جو اسلام اور مغرب کے درمیان پیدا ہوگئی تھیں کیوں کہ کتاب کے اکثر مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جوہر اسلام کے ہمہ گیر نظریہ حکومت کو پیش کرنا چاہتے ہیں اور وہ انسان کو اللہ کے نائب کی حیثیت سے دیکھتے تھے[۸]۔

عثمانوی خلافت کے زوال کو سید مودودی نے عالم گیر اسلامی مرکز کے خاتمے کی حیثیت سے دیکھا تھا اور وہ اس نقصان کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔محمد مرزا دہلوی کی کتاب اتاترک پر تبصرہ کرتے ہوئے ترکی زبان کی تبدیلی اور فکری منہاج کے

تبدیل ہونے پر انھوں نے گہرے تاسف کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> کاش اتا ترک نے قرآن اور سیرت محمدی کا مطالعہ کیا ہوتا اور ترکی قوم پرستی کے بجائے اسلامی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر جدید ترکی کی تعمیر کی ہوتی۔ اس کو اگر معلوم ہوتا کہ ایک محدود قومیت کی طاقت اور عالم گیر تبلیغی مسلک کی طاقت میں کتنا تفاوت ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کو پولینڈ، ہالینڈ اور بلجیم کی سی پوزیشن میں چھوڑ کر نہ جاتا۔ بلکہ روسی اشتراکیت سے بیس گنی زیادہ زبردست طاقت کے ساتھ چھوڑتا[9]۔

سید مودودی نے سمرنا میں یونانی مظالم میں یونانی فوج نے جو ہولناک مظالم کیے تھے ان کے معتبر ترین ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مفصل حالات کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب چالیس رپورٹوں اور مراسلات کے ترجموں پر مبنی ہے۔ جنھیں اتحادی افسروں، یورپین باشندوں، ترکی افسروں اور خود سمرنا کے مظلوم مسلمانوں نے دولت عثمانیہ کی وزارت داخلہ اور یورپین اخبارات کو بھیجے تھے۔

یہ دونوں کتابیں اب ماضی کا حصہ ہو چکی ہیں مگر ان کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ بدستور قائم ہے۔ جنگ سمرنا اور ترکی پر حوادث کے اثرات سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ اور تہذیب اس طرح پیوست ہے کہ اس سے آج بھی ہمارے تخیل اور ہماری تاریخ کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اسلام پسند طبقہ سلطنت عثمانیہ کی محبت میں گرفتار ہے تو جدید خیالات رکھنے والے جدید ترکی کو اپنا مثالیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

عثمانیوں اور یونانیوں نے سمرنا کے حوالے سے دو جنگیں لڑی ہیں۔ ان کی آخری لڑائی ۱۹۱۷ میں ہوئی جس میں ترکی کامیاب ہوا مگر یونانیوں نے سمرنا میں جس طرح مظالم ڈھائے اس نے ترکوں کے جذبہ حریت کو کئی گنا توانا کر دیا تھا۔ ترک خود بھی جفاکش اور جنگ جو رہے ہیں ان کی اسی ہمت نے انھیں یورپی قوتوں کے لیے ایک مشکل ہدف ثابت کیا۔

سمرنا میں یونانی مظالم کے تعلق سے مولانا مودودی نے ان رپورٹوں کے ترجموں کے علاوہ اس میں ایک نہایت عمدہ مقدمہ بھی لکھا تھا جس سے اس شہر کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ اس مقدمے میں ترکوں سے مولانا مودودی کی گہری محبت بھی عیاں ہے۔ ترکی میں عیسائیوں کی حالت میں دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

> یہ رسالہ دراصل یورپ کے لیے لکھا گیا تھا۔ یورپ کے لوگوں کو ارمنوں، یونانیوں اور خود یورپ کے دسیسہ کاران سیاست نے جھوٹے قصوں، ناولوں، رسالوں، اخباروں، تقریروں اور دوسرے تبلیغی ذرائع سے ترکوں کے خلاف ابھار کر جس قدر انھیں نقصان پہنچائے ہیں ان کی تلافی کے اور طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کو اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے اور وثائق و حقائق ان کے سامنے رکھ کر ان کو بتلا دیا جائے کہ ترکی محکوم اقوام کے معاملے میں خود یورپ سے بدرجہا روادار، منصف اور کریم ہے[10]۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کتاب کا ترجمہ کرنا اس لیے بھی ضروری سمجھا کہ خود ہندوستان میں انگریزی خواں طبقے نے مسلمانوں میں ترکی کے حوالے سے جھوٹی خبریں اور غلط افواہیں پھیلانا شروع کر دی تھیں۔ وہ ترکوں کو ظالم، متعصب

اور سخت گیر مشہور کرتے تھے۔خاص کر سلطان عبدالحمید دوم (۱۸۴۲ء-۱۹۱۸ء) کے حوالے سے بے بنیاد الزامات کوفر وغ دیا گیا۔ان الزامات کو نادان اور کم زور ذہن رکھنے والے سچ بھی مان لیتے تھے۔

مولانا مودودی نے ترکی میں عیسائیوں کی حالت بیان کرنا اس لیے بھی ضروری خیال کیا کہ ہندوستانی عرصہ دراز سے صوبائی خودمختاری طلب کر رہے تھے جب کہ دنیا کی سب سے زیادہ مہذب کہلانے والی برطانوی حکومت اسے دینے سے مسلسل انکار کر رہی تھی۔حالاں کہ ترکوں نے صدیوں سے ہر غیر مسلم قوم کو مکمل خودمختاری دے رکھی تھی۔وہ اس کتاب میں یہ بتانے کے بھی خواہاں ہیں کہ ترکوں نے وہاں کے عیسائیوں کو جس طرح مذہبی آزادی فراہم کی تھی وہ ہندوستانی مسلمانوں کو برطانوی سامراج دینے کے لیے آمادہ نہیں تھا جب کہ ترکوں نے اپنی عمل داری میں پانچ صدیوں سے یہ حقوق اقلیتوں کو دیے ہوئے تھے [۱۱]۔

ترکی میں عیسائیوں کی حالت کے دو ابواب ہیں جس کے ذیل میں چند عنوانات کے ذریعے مصنف نے بیسویں صدی میں ترکوں کے یہاں اقلیتوں کی انسانی وقانونی مراعات کی وضاحت کردی ہے جس میں مذہبی،دستوری،ملکی وقانونی اور سیاسی حقوق شامل ہیں۔اس کتاب کی تمہید میں مترجم نے ترکی میں عیسائیوں کی حالت پر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ترکی میں عیسائی باشندے اس قدر خوش حال اور قانون کی رو سے اس قدر آزاد ہیں کہ اتنی خوش حالی اور آزادی ترکوں کو بھی حاصل نہیں،اقلیتوں کو ترکی کی حکومت کی طرف سے اس قسم کی مراعات حاصل ہیں کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کے ماتحت اپنا اندرونی انتظام خود کرتے ہیں [۱۲]۔

اس کتاب میں سلطنت عثمانیہ میں سیاسی وسفارتی خدمات انجام دینے والے کئی اہم لوگوں کے بیانات کو بھی شامل کیا گیا۔جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جو رعایت اور خاص حقوق عیسائی باشندوں کو سلطنت میں حاصل تھے وہ خالص مذہبی تھے اور مذہبی آزادی کی حیرت انگیز مثال پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔تمام اقوام کو نہایت وسیع پیمانے پر حقوق حاصل تھے اور ایک طرح سے انھیں اپنی اندرونی وعائلی زندگی میں ایسی خودمختاری حاصل تھی جو کسی دوسری سلطنت نے اپنی رعایا کو عطا نہیں کی تھی [۱۳]۔

ترکی میں عیسائیوں کی حالت میں مصنف نے یورپی قوتوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھا ہے کہ بیسویں صدی میں حق اور انصاف کو ہر جذبہ پر غالب رہنا چاہیے مگر یورپی اقوام مذہبی تعصب کی بنیاد پر غیر اقوام پر جھوٹے الزامات لگاتی ہیں اور ترکوں پر لگایا جانے والا یہ الزام کہ وہ اپنے ملک میں اقلیتوں کا تحفظ نہیں کرتے بالکل بے جا ہے کیوں کہ ترکوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کی عمل داری میں تعداد میں قلیل اقوام ہمیشہ خوش رہی ہیں [۱۴]۔کتاب کے پہلے باب میں مصنف نے عثمانوی دستور کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

> عثمانوی دستور کی گیارہویں دفعہ میں ہم کو یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ میں ہر مذہب وملت کے لوگوں کو اپنے اعمال مذہبی میں کامل آزادی حاصل ہے۔ بہ شرطے کہ وہ امن عامہ کے خلاف نہ ہوں [۱۵]۔

اس کتاب میں مصنف نے سلطنت عثمانیہ کے کردار کا جائزہ لیتے ہوئے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ عہد میں مغربی اقوام نے جس انداز میں جدید تہذیب کے علم کو بلند کیا ہے کیا اس کے نتائج دنیا پر وہی ہیں جیسے بیان کیے جاتے ہیں۔ جب کہ حقیقت اور عمل کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں۔ کیوں کہ خود مغربی اقوام میں مذہبی منافرت اور فرقہ واریت جس تیزی سے سرایت کر رہی ہے اس کی بنیادیں تاریخ میں اس سے زیادہ گہری رہی ہیں۔

مصنف نے چند مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک لوتھرین کو کیتھولک ہو جانے پر جلاوطنی اور جائداد ضبط کیے جانے کی سزا سنائی گئی، یونانی قانون تبدیلِ مذہب کو روکتا ہے۔ پولینڈ میں گریک چرچ کے خلاف جو سخت احکامات جاری ہوئے وہ دنیا کے سامنے ایک مثال ہیں۔ بیسویں صدی میں برطانیہ میں لا مذہبوں کو پارلیمنٹ میں جگہ نہیں دی جاتی تھی [۱۶]۔

ان مثالوں کو پیش کیے جانے کا مقصد یہی تھا کہ سلطنت عثمانیہ پر لگائے گئے الزامات کو رد کیا جائے کیوں کہ عثمانوی عہد میں یونانی، ارمن، یہودی، لاطینی ایک بڑی حکومت کے اندر اپنی اپنی جدا حکومتیں رکھتے تھے۔ ہر ایک اپنی مذہبی آزادی کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ اس کتاب کے باب اول میں اس کی کئی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں کہ وہاں غیر اقوام کو کس طرح کے حقوق حاصل تھے۔ ان حقوق کے علاوہ اقلیتوں کو اور کیا بنیادی سہولیات میسر تھیں اس کی بھی تفصیلات ہمیں ملتی ہیں ان کی عبادت گاہوں کو ملنے والی مراعات کی بھی تفصیلات اس کتاب میں موجود ہیں [۱۷]۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اس کتاب میں یہ بات کہ سلطنت عثمانیہ میں اقلیت اس کی حدود میں ریاست کے درجے میں رہتے تھے اس کا اظہار ترک محقق صادق البیراک نے ترکی زبان میں *Turkia yeide Din kavgasi* کے نام سے مختصر سی کتاب میں بھی لکھی۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ پاکستانی اسکالر محمد خان کیانی نے *Religious struggle in Turkey During the transformaition from Caliphate to Secular republic* کے نام سے کیا تھا جو استنبول میں شائع ہوئی۔ اس میں صادق البیراک نے لکھا ہے کہ ۱۸۳۹ء میں گلھین پارک (Gulhane Park) نامی اصلاحات عثمانیوں کے یہاں متعارف ہوئی۔ ان اصلاحات کے ذریعے مغربی خیالات وثقافت کا رخ ترکی معاشرے کی جانب کر دیا گیا۔ یورپی قوتوں کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے خلافت اور اتحادِ بین المسلمین کا تصور ان کے یہاں ناپید ہو جائے گا اور Cosmopolitan Ottomanism کا زمانہ آئے گا۔ ان اصلاحات اور تصور کے ذریعے دولت عثمانیہ میں اقلیتوں کو مستحکم انداز میں ابھرنے کا موقع ملے گا [۱۸]۔

یورپی قوتوں نے عثمانیوں کو اس معاہدے کے بعد اتنا دبایا کے رشید پاشا کے دور میں مسلمانوں کی حق تلفی کر کے اقلیتوں کو خوش کرنے کے لیے زیادہ مراعات دی گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت عثمانیہ کے حدود میں آباد عیسائی اور

یہودی اور دیگر اقوام ریاست کے اندر ریاست State within State کی حیثیت اختیار کر گئے۔عیسائیوں نے سفارتی ذرائع استعمال کر کے وہ مراعات حاصل کرلیں جوان کے اجداد تلوار کی نوک پر بھی حاصل نہ کر سکے تھے۔سلطنت عثمانیہ ان حالات میں غیر معمولی دباؤ کا شکار تھی۔معاشی اور فوجی امداد کی پیش کش کے عوض عالمی طاقتوں نے سلطنت عثمانیہ میں بسنے والے عیسائیوں اور دیگر اقلیتوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات کو یقینی بنایا۔کریمیا کی جنگ کے بعد ۱۸ فروری ۱۸۵۶ء کو Hatt-i-Humayun نے جو فرمان جاری کیا اس نے دولت عثمانیہ کے غیر مسلموں کو مسلمانوں کے برابر لا کھڑا کیا[19]۔

سلطنت عثمانیہ کو اندرونی طور پر کمزور کرنے کے لیے یورپ کی عیسائی طاقتوں نے اقلیتوں کا سہارا لیا۔املاک کو تباہ کرنے یا اس پر قبضہ کرنے کی سازش بھی کی گئی اور اس میں یورپی قوتیں کافی حد تک کامیاب ہوئیں۔ہر جنگ کے بعد سلطنت عثمانیہ کو کچھ زمین اور اچھی خاصی دولت سے محروم ہونا پڑا۔ترک خزانے لوٹ لیے گئے،مساجد اور مدارس کو شہید کر دیا گیا۔ان میں جوئے کے اڈے اور رقص گاہیں،شراب خانے یا اصطبل کھول دیے گئے۔لاکھوں مسلمانوں کو قتل یا بے گھر کر دیا گیا اور خواتین کی بے حرمتی کی گئی[20]۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے کتاب کے آخر میں ترکی میں مختلف اقوام کی نسبت اعداد و شمار بھی پیش کیے ہیں۔جن میں یورپین ترکی،ایشیائے کوچک،ولایت سمرنا،ارمن ولایت شامل ہیں۔یہ اعداد و شمار مشہور فرنچ جغرافیہ دان موسیو وٹال کوئنٹ نے اپنی کتاب ترکی ڈی ایشیا میں پیش کی تھیں[21]۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ترجمہ سمرنا میں یونانی مظالم جو مختلف رپورٹوں پر مبنی ہے۔یہ رپورٹ اتحادی حکومتو ں (امریکا،برطانیہ،فرانس،اٹلی) کے مقرر کردہ کمیشن کی تحقیق پر مبنی ہے جو لوزین کی انجمن عثمانیہ نے شائع کی تھی۔یہ کتاب بھی اردو خواں طبقے کے لیے کئی لحاظ سے اہم ہے۔اس میں سید مودودی نے جامع مقدمہ بھی تحریر کیا۔یونانیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ سمرنا میں یونانیوں کی تعداد ترکوں سے زیادہ ہے اس لیے اس پر اہل یونان کا حق ہے۔سید مودودی نے اس دعوے کی نفی کرتے ہوئے سمرنا میں بسنے والی مختلف اقوام کی آبادی کا جائزہ بھی پیش کیا تھا۔جس سے یونانی قوم کے دعوے کی نفی ہوتی تھی۔

شہر سمرنا چوں کہ ایسا سمندری راستہ تھا جسے عثمانی ترکوں سے چھین لینے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ ساری دنیا کے دست نگر بن کر رہ جائیں اور پھر برطانوی حکومت ان سے اپنے مطالبات منوانے میں کامیاب ہو سکے۔جنگ سمرنا کے موضوع پر ہندوستانی دانش وروں کی ایک کثیر تعداد ایسی تھی جس نے برطانوی حکمت عملی کو نہایت مکروہ قرار دیا۔ان کے مضامین اور کتابوں کے تراجم ان خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔سید ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ کتاب اب کم یاب ہے اس کے موضوعات بھی وقت گزرنے کے ساتھ پرانے ہو چکے ہیں مگر اس وقت کی صورت حال اور عثمانیوں اور یونانیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ بھی اہم ہے۔کیوں کہ اس میں موجود تاریخی حقائق یونانی دراندازی

کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر برطانوی کردار اس سلسلے میں کیا رہا تھا اس کو ایک جگہ بیان کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ:

> انگریز اگرچہ اسلامی ممالک پر قبضہ کرنے میں بہت کم تامل کرتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو احمق بنانے کے لیے وہ بعض ممالک پر خود قبضہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے اور دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اکساتے ہیں، یہی حال سمرنا کا تھا۔ اگرچہ انھوں نے خود اس پر قبضہ نہیں کیا لیکن وہ یونان کے قبضے کو بھی اپنے ہی قبضے کے برابر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی کونسل نے نہایت آزادی کے ساتھ یونان کے مقبوضہ علاقے میں ایک ارمن کا فیصلہ کر دیا[۲۲]۔

وہ تمام رپورٹیں جو اس کتاب میں درج کی گئی ہیں مختلف ذرائع سے حاصل کی گئیں تھیں۔ جن سے سمرنا پر یونانی قبضے کے بعد کی صورت حال سامنے آجاتی ہے۔ سمرنا کی تاریخ پر جتنی کتابیں لکھی جائیں ان میں اس کتاب کو ضرور حوالے کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایسی رپورٹیں بھی شامل ہیں جو مختلف سیاسی، سماجی اور صحافتی خدمات انجام دینے والوں نے دیکھی تھیں جیسے کپتان ڈکسن جانسن (Dixson Johnson) سمرنا سے ۲۱ رمئی ۱۹۱۹ء کو خط میں لکھتا ہے کہ جب ترک افواج بیرکوں میں واپس چلی گئیں تو یونانی انھیں بیرکوں سے واپس نکال لائے اور ہر اس شخص کو قتل کر دیا جس نے زیٹو دینی زیلوس (Zeto Ve nizelos) کا نعرہ نہیں لگایا۔ ڈکسن جانسن نے اور بھی دو خطوط سمرنا کے حوالے سے لکھے تھے، وہ ان واقعات کا عینی شاہد تھا۔ کیوں کہ سمرنا کے یونانی قبضے کے دوسرے دن وہ وہاں پہنچا تھا۔ اس نے یہ خطوط لندن میں موجود دفاع اسلام کے نام پر بھیجا تھا[۲۳]۔

مودودی صاحب نے عثمانی ترکوں کے کردار پر اپنی کتاب تنقیحات میں خالدہ ادیب خانم کے خطبات کے مجموعے ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ترکی کی نئی نسل جس نے خلافت کے ادارے کا خاتمہ کر دیا اب وہ مادہ پرستی، دہریت، مغرب سے کامل مرعوبیت، مغربی تخیلات کی اندھی تقلید کر رہی ہے وہ اسلامی وحدت اور قدیم چیزوں سے بےزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا ہے کہ اگر ترقی کرنی ہے تو بالکل مغربی طرز پر چل کر ہی ترقی کا قصر تعمیر کرنا پڑے گا[۲۴]۔ سید مودودی نے اس رویے پر وہاں کے علما کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے ان کا یہ کہنا درست تھا کہ بدلتے ہوئے حالات میں ترکی علما نے وہ کردار ادا نہیں کیا جس کی اس وقت ضرورت تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ مولانا مودودی کی یہ بات درست ثابت ہوئی۔ ترکوں نے نہ صرف اپنے رسم الخط کو تبدیل کر دیا' بلکہ معاشرتی بنیادوں میں اسلام بےزاری کو فروغ دیا۔ اس انتہا پر جانے کے باوجود بھی ترکوں کے دل میں اسلام کی محبت کو مٹایا نہیں جا سکا' جس کی مثال آج کے ترکی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حال ہی میں ترکی کے صدر طیب اردوگان نے تہذیبوں کے اتحاد کے نام سے اقوام متحدہ کے ادارے میں ویانا کے ہاف برگ پیلس میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے

کہ:

ہماری توجہ ان جھگڑوں پر مسلسل مرکوز رہنی چاہیے جو ایشیا اور افریقا میں چل رہے ہیں۔ خاص طور پر بلقان اور مشرق وسطی میں پائے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ خوابیدہ خطرات بھی جو دنیا کے ممکنہ جنگوں میں موجود ہیں ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہونے چاہئیں۔ بدقسمتی سے شام کے معاملے میں جدید دنیا اس امتحان پر پوری نہیں اتر سکی۔ ہمیں علم ہے کہ گزشتہ دو سالوں میں ستر ہزار کے قریب لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ یہ بات کہ دنیا نے اس صورت حال پر کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ احساس انصاف کو سنگین طور پر مجروح کرتا ہے۔ اسی طرح تہذیبوں کے اتحاد کے روبرو یورپ میں بڑھتی ہوئی نسل پرستی پُر مسائل شعبہ ہے۔ مزید برآں، مسلم ممالک سے لاتعلقی کے ساتھ ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ جو مسلمان اپنے ملک کے علاوہ کسی دوسرے ملک میں سکونت پذیر ہیں تو انھیں درشت، معاندانہ اور ہتک آمیز رویوں کا سامنا ہے [۲۵]۔

طیب اردوگان نے اس رویے پر سخت تنقید کی اور کہا کہ یہ ایک نامعقول عمل ہے جو دنیا بھر میں جاری ہے۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ دیگر لوگوں کے عقائد اور ثقافتوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے عمل کی بنیاد تعصب ہے اور وہ دوسروں کا مقاطعہ کرتے ہیں اور ان سے نفرت برتتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم صیہونیت، سام دشمنی اور فسطائیت کو بھی انسانیت کے خلاف ایک جرم قرار دیں۔ انھوں نے ذرائع ابلاغ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اس کے کردار کو نفرت اور اشتعال دلانے والا قرار دیا اور کہا کہ اس عمل سے تعصب کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں [۲۶]۔

طیب اردوگان کے خیالات موجودہ ترکی کے سیاسی کردار کو بھی واضح کرتے ہیں۔ مشرق وسطی میں ماضی کی طرح جغرافیائی، تہذیبی اور فکری انتشار جس انداز میں پھیلایا گیا ہے وہ وہی ہے جو انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں سلطنت عثمانیہ کے ساتھ اس وقت برطانیہ اور اس کے اتحادی قوتوں نے کھیلا تھا۔ روس اور امریکا کے مفادات خواہ مشترک نہ ہوں مگر ان کا کردار مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ رویے کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ شام، عراق اور یمن میں جاری خانہ جنگی کے نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں اس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے مگر جارحانہ قوتوں کی حکمت عملی اگر اسی طرح مسلم ممالک میں جاری رہیں تو مسلمان حکمرانوں کے کردار پر بحث کی گنجائش موجود ہو رہے گی کہ وہ مسلسل ناکامی سے کیوں دوچار ہیں۔

ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ ترکی کی سیاسی حکمت عملی میں اتحاد اسلام کو فروغ دینے کی کوششیں بار ہا دکھائی دیتی ہیں۔ دنیائے اسلام میں سیاسی برتری جس طرح ترکوں کے حصے میں آئی ہے ویسی کسی دوسری قوم کو نصیب نہیں ہوسکی۔ ترکوں میں انجمن نو جوانان کی تحریک نے ترکوں کو عہد اسلامی کی تاریخ سے جس طرح قطع تعلق کرنے پر مجبور کیا ہے اس کی داستان نہایت طویل ہے مگر اس کا خمیازہ بھی ترکوں کو کئی نسلوں تک بھگتنا پڑے گا۔

جنوبی ایشیا کے مسلمان ترکوں کی تاریخ اور تہذیب سے ربط رکھتے ہیں اس لیے وہاں کی سیاسی زندگی میں ہونے والی

تبدیلی کے اثرات یہاں پر بھی پڑتے ہیں۔ مذہبی طبقہ یہ چاہتا ہے کہ ترک احیائے اسلام کی جدوجہد میں دوبارہ وہی کردار ادا کریں جو ان کے آبا کرتے رہے ہیں جب کہ جدیدیت کے حامی ہر اس وحی کو جو انقرہ سے نازل ہوتی ہے مسلمانوں کے سامنے اس طرح پیش کرتے تھے گویا قرآن منسوخ ہو چکا ہے اور رسالت ختم ہو گئی ہے۔ اب ہدایت ہے تو اتاترک کے اسوہ میں ہے [۲۷]۔

یورپی اور امریکی سیاسی تناظر میں ترکی اور دیگر مسلمان ممالک کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ دکھائی دے گا کہ جس عالمی رواداری کا مظاہرہ مسلمانوں نے کیا ہے وہ مغربی اقوام کی دہشت و بربریت کے سامنے ایک مثال ہے بہ شرطے کہ ہم انصاف سے تاریخ اور موجودہ تناظر کا مطالعہ کریں۔ موجودہ عہد میں مسلمان ملکوں میں دیگر اقوام کو جس طرح مذہبی آزادی حاصل ہے وہ اکیسویں صدی کے یورپ اور امریکا میں مسلمانوں کو میسر نہیں ہے۔ اس لیے فرانس اور جرمنی میں حجاب پر پابندی کے حوالے سے جو ردِ عمل ظاہر ہوا ہے وہ ان کی حکومتوں کے ذہنی رویے کی عکاس ہے۔

جدید ترکی نے یورپی قوتوں کا ساتھ اپنی خواہشات سے بڑھ کر دیا ہے مگر وہ تاریخ کے ان مسائل کو کبھی بھی حل نہیں کر سکتا جو سلطنت عثمانیہ اور اہل یورپ کے ساتھ کئی صدیوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی حالیہ مثال *The Economist London* ۲۸ رجنوری ۲۰۱۲ء کی ایک رپورٹ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جنوری ۲۰۱۲ء میں فرانس کی سینیٹ میں ایک بل پیش کیا گیا، جس کے تحت ۱۹۱۵ء میں آرمینیا میں ترکوں کے قتل عام کو جھٹلانا جرم قرار پائے گا۔ اس وقت کے ترک وزیر اعظم رجب طیب اردوگان نے فرانسیسی حکومت کو متنبہ کیا ہے کہ اس بل کو منظور کر کے قانون بنانے کے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے [۲۸]۔

یورپ نے ترکی کو ان تاریخی حقیقتوں سے فراموش کر کے نہیں دیکھا اور نہ ہی آئندہ اس کے امکانات ہیں۔ روس کی شام میں بڑھتی ہوئی مداخلت نے ترکی کی خارجہ پالیسی کو مشکلات کا شکار کر دیا ہے۔ اس سنبھلتی ہوئی قوت کو مشرق وسطی میں جاری خانہ جنگی نے کئی محاذ پر بیک وقت مصروف کر دیا ہے جس سے موجودہ ترکی عہدہ برآ ہوتا ہے یا نہیں یہ فیصلہ ہونا باقی ہے۔ روس سے ترکی کی جاری مخاصمت تین صدیوں پرانی ہے یہ دونوں ہمیشہ سے روایتی حریف رہے ہیں۔

سید مودودی نے ترکی اور اسلامی ملکوں میں پروان چڑھتی ہوئی نیشنل ازم کی تحریکوں پر تنقید کی ہے۔ انھوں نے اس نظریے کو اسلامی فکر کے علی الرغم قرار دیا اور اتحاد امت کی ترویج و اشاعت پر خصوصی توجہ دینے کے لیے کہا۔ ان کی فکر میں اتحاد امت ایک ایسی قوت بن کر سامنے آتی ہے جو زندگی کے ہر دائرہ کار میں کسی مسئلے کو علاقائی اور جغرافیائی بنیادوں پر نہیں دیکھتی، بلکہ عالمی اسلامی برادری کے ایک شریک کار کے طور پر ان مسائل کا حل چاہتی ہے جو دنیا میں پھیلے ہوئے مختلف خطوں میں آباد مسلمانوں کو لاحق ہیں انھوں نے مغرب کی جارح قوتوں کا محاکمہ اس انداز میں کیا ہی وہ لکھتے ہیں کہ:

> اس وقت مغرب کی جابر قوتوں کی وجہ سے اسلامی ممالک میں کش مکش برپا ہے۔ ہماری ہمدردیاں ان ملکوں کے

ساتھ ہے جو اپنے جائز حقوق کی جدوجہد کر رہے ہیں ان کے ساتھ ہمدردی اس بنیاد پر نہیں کہ وہ مسلمان ہیں بلکہ اس بنیاد پر بھی ہے کہ وہ مظلوم ہیں۔حق ان کے ساتھ ہے اور ان کا حریف سراسر ناحق ہے ۲۹۔

نیشنل ازم کی بنیاد پر استوار ہونے کی وجہ سے ہم اپنے بھائی مسلمانوں کی جائز مدد کرنے کے بھی قابل نہیں رہتے۔اسی لیے سید مودودی نے اس نظریے کو اسلام سے متصادم قرار دیتے ہوئے اس کے حاملین کے بارے میں کہا کہ: اس نظریے کے پیروکار خدا اور مذہب کو بھی قومی بنا دیتے ہیں۔یہ نظریہ انسانوں میں ایسا تعصب پیدا کر دیتا ہے جسے جاہلی عصبیت کے سوا کچھ قرار نہیں دیا جا سکتا ۳۰۔انھوں نے لکھا کہ:

> نیشنل ازم اختیار کر کے اس کے فطری تقاضوں سے کون بچ سکتا ہے؟ غور کیجیے، آخر وہ کیا چیز ہے جو قوم پرستانہ طرز فکر اختیار کرتے ہی ایک مصری نیشنلسٹ کا رخ خود بہ خود عہد فراعنہ کی طرف پھیر دیتی ہے؟ جو ایرانی کو شاہنامے کی افسانوی شخصیتوں کا گرویدہ بنا دیتی ہے؟ جو ہندوستان کو پراچین سمے کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے اور گنگ و جمن کی تقدیس کے ترانے اس کی زبان پر لاتی ہے؟ جو ترک کو مجبور کرتی ہے کہ اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی تمدنی زندگی کے ایک ایک شعبے سے عربی اثرات کو خارج کر کے اور ہر معاملے میں عہد جاہلیت کی ترکی روایات کی طرف رجوع کرے؟ ۳۱۔

ترکوں نے جب اتحاد اسلام کے نظریے سے روگردانی کی تو ان میں ایسی دل چسپیاں پروان چڑھیں جو تہذیبی و تمدنی اعتبار سے محدود دائرے میں تھیں اور اس دائرے میں خود کو مقید کر کے اس قوم نے عالمی اسلامی اقوام کی سیادت سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترک کئی معاملات میں تنہا ہو گئے۔سید مودودی نے جدید ترکی کے بانی گوک الپ ضیا کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ نیشنل ازم آدمی کے دماغ کو اسلام سے جاہلیت کی طرف پھیر دیتا ہے ۳۲ کیوں کہ گوک الپ ضیا نے کہا تھا کہ اسلام ہمارے مناسب حال نہیں ہو سکتا اگر ہم اپنے عہد جاہلیت کی طرف رجعت نہ کریں تو پھر ہمیں ایک مذہبی اصلاح کی ضرورت ہے جو ہماری طبعیت سے مناسبت رکھتی ہو۔

۲۱ راگست ۱۹۶۹ء میں جب مسجد اقصیٰ کو شہید کر دیا گیا تو لاہور میں مولانا مودودی نے ۲۴ راگست ۱۹۶۹ء میں تقریر کرتے ہوئے ترکوں کے کردار پر نیشنل ازم کے گہرے اثرات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ مغربی سیاست کاروں نے جس میں یہودی بھی کام کر رہے تھے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا،انھوں نے ترکوں میں یہ تحریک اٹھائی کہ وہ سلطنت کی بنیاد اسلامی اخوت کے بجائے ترکی قوم پرستی پر رکھیں، حالاں کہ ترکوں کا جغرافیہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ترکی میں صرف ترک آباد نہیں ہیں بلکہ عرب اور کرد بھی ہیں۔اس کے علاوہ دوسری نسلوں کے مسلمان بھی آباد ہیں۔ایسی سلطنت کی بنیاد صرف ترکی النسل لوگوں پر رکھنے کے صاف معنی یہ تھے کہ تمام غیر ترک مسلمانوں کی ہم دردیاں اس کے ساتھ ختم ہو جائیں گی ۳۳۔دوسری جانب عربوں اور دیگر اقوام کو اس بات پر ابھارا گیا کہ وہ ترکوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں ۳۴۔

موجودہ ترکی میں جاری اندورونی مخاصمت کا اندازہ اس پس منظر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے گردصوبے آج بھی کئی حوالوں سے ترک ریاست کے ہم راہ نظر نہیں آتے۔مغربی قوم پرستی کی بنیاد پر استوار ہونے والے جدید ترکی میں بڑھتی ہوئی خوں ریزی کی بنیادی وجوہات کو ان امور میں ساتھ تلاش کیا جانا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔سید مودودی کے ان خیالات کا اعادہ اس لیے کیا جانا ضروری ہے کہ ترکوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو اسلامی فکر کے بنیادی تصورات سے شعوری طور پر علاحدہ کیا۔بیسویں صدی میں ترکوں کے انحطاط کی وجہ سے مسلمانوں کی وحدت کو نظری بنیادوں پر اسی نیشنل ازم کی تحریک نے نقصان پہنچایا تھا۔اسی لیے سید مودودی نے اپنی فکر میں امت کی تشکیل نو کو مرکزی اہمیت دی ہے۔

روس اور یورپ کی دولت عثمانیہ سے جاری مخاصمت کا مطالعہ مصطفی کامل پاشا (۱۸۷۴ء-۱۹۰۸ء) کی کتاب مسئلہ شرقیہ [۳۵] میں موجود ہے۔جس کا اردو ترجمہ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے کیا تھا۔اس ترجمے سے سید مودودی کی فکری جہت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔عالم اسلام میں جاری مشرق ومغرب کی کش مکش میں تاریخی موڑ سلطنت عثمانیہ کا زوال تھا اور اس سقوط نے عالم اسلام کی تاریخ سے خلافت کے تصور کو ناپید کردیا اور مسلمان مرکزی حیثیت میں پھر کبھی مجتمع نہیں ہوسکے۔مصطفی کامل پاشا کی اس کتاب کے ترجمے کی غایت یہی تھی کہ مسلمانوں کو مغربی حکمت عملی کے تضادات سے آگاہ کیا جائے۔اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں مسلمان عالمی قوتوں کی چیرہ دستیوں کا جس انداز میں شکار ہورہے تھے اس کے تسلسل کو سمجھنے کے لیے ترکوں کی تاریخ اور یورپ پر اس کی فتح کا جائزہ ضرور لینا اشد ضروری ہے۔

حوالے وحواشی:

۱۔ عبدالباری، سید، ڈاکٹر، ۲۰۰۹ء، انوکھے لوگ نرالی باتیں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۳۳؛ خلافت عثمانیہ کے تعلق سے مولانا مودودی کے یہاں مضامین کا تسلسل دیکھنے کو ملتا ہے۔مولانا مودودی جب رسالہ الجمعیۃ (۱۹۲۵ء-۱۹۲۸ء) کے مدیر تھے تو اس وقت انھوں نے عالم اسلام کے موضوعات پر کئی اہم تاریخی وتجزیاتی اداریے لکھے۔ترکوں کے ساتھ ہونے والی پے درپے زیادتی کو انھوں نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ مسلمانوں کی اس مرکزیت کے انہدامی عمل کو دیکھ کر مولانا مودودی کافی مضمحل ہوگئے۔

۲۔ مسئلہ آرمینیا کی تفصیلات مصطفی کامل پاشا کی کتاب مسئلہ شرقیہ میں دیکھی جاسکتی ہے اس کا ترجمہ سید مودودی نے کیا تھا۔یہ مسئلہ عثمانوی تاریخ میں کئی مواقع پر سر اٹھاتا رہا تھا۔ ۱۸۹۳ء میں انگورہ کی عدالت نے ارمن باغیوں پر مقدمہ چلایا اور ان پر بغاوت ثابت ہوگئی۔ان باغیوں کے سرکردہ لوگوں نے ارمنوں کو عثمانوی خلافت کے خلاف ابھارا اور خود ترکوں کا بھیس بدل کر ارمنوں کو قتل کرتے اور ترکوں کو بدنام کیا جاتا۔یہ مسئلہ دوسری مرتبہ ۱۹۱۵ء میں اٹھا جب عثمانی حکومت نے مجبور ہوکر جنگی محاذوں کے قریبی علاقوں میں موجود آرمینیائی باشندوں کو دولت عثمانیہ کے مختلف علاقوں میں بسایا تھا۔یہ نقل مکانی صرف جنگ کے علاقے میں موجود آرمینائی باشندوں کے لیے تھا۔ورنہ دوسرے علاقوں میں موجود آرمینیائی اس سے مستثنیٰ تھے۔

۳۔ یہ کتاب ضیا محمد شفیق نے ۱۹۱۹ء میں ترکی کانگریس لوزین سے شائع کرائی تھی۔اس کتاب میں انگریز اور فرنچ افسران کی رپورٹیں یونانی

مظالم کی تاریخی شہادت فراہم کرتی ہیں۔اس میں مئی سے جولائی ۱۹۱۹ء تک کے حالات موجود ہیں۔

۴۔ خالد،سلیم منصور،رانا جمیل احمد، ۱۹۹۸ء،تذکرہ سید مودودی،جلد سوم،ادارہ معارف اسلامی،لاہور،ص ۱۶۷

۵۔ عبدالباری،ص ۳۳

۶۔ اختر،سفیر،ڈاکٹر، ۲۰۰۴ء،سید ابو الاعلیٰ مودودی اور ان کا سرمایہ قلم بھولی بسری تحریروں کی روشنی میں،دارالمعارف،ص ۸۵

۷۔ مودودی،ابوالاعلیٰ،سید،دیباچہ ۱۹۲۲ء،ترکی میں عیسائیوں کی حالت،دارالاشاعت سیاسیات مشرقیہ،دہلی،ص ۱

۸۔ ایضاً،ص ۲۹۵؛مولانا مودودی کی مولانا محمد علی جوہر سے محبت کا اندازہ ان کے ایک چھوٹے سے مضمون جو رسالہ الجمعیۃ میں مولانا محمد علی کی صحت کے عنوان سے شائع ہوا جس میں مولانا مودودی نے اپنی محبت اور دیرینہ وابستگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:''مولانا شوکت علی نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے اپنے عزیز بھائی اور اسلامی ہند کے مایہ ناز فرزند کی زندگی کے لیے جن خطرات کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے لیے بے حد رنج والم کا باعث ہیں۔اگر مسلمانوں نے خصوصاً اور تمام باشندگان ہند نے عموماً اس طرف جلد توجہ کر کے مولانا موصوف کی مشکلات کو کم نہ کیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ایک نایاب گوہر کو کھودیں گے۔تفصیلات کے لیے دیکھیے:مودودی،سید ابوالاعلیٰ،ستمبر ۲۰۱۶ء،صدائے رستاخیز،مرتبہ:خلیل احمد حامدی،ادارہ معارف اسلامی لاہور،ص ۲۷۹

۹۔ ایضاً،ص ۳۰۱

۱۰۔ مودودی، ۱۹۲۲ء،ص ۱

۱۱۔ ایضاً،ص ۲

۱۲۔ ایضاً،ص ۳

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً،ص ۶

۱۵۔ ایضاً،ص ۷

۱۶۔ ایضاً؛مولانا مودودی نے اس سلسلے میں ایک اور مثال قائم کی کہ ۲۶/اپریل ۱۸۸۱ء کسٹر بریڈلا صرف اس وجہ سے برطانوی پارلیمنٹ سے خارج کردیے گئے کہ وہ مذہباً دہریہ تھے۔

۱۷۔اقلیتوں کو بہت سی مراعات حاصل تھیں مثلاً چرچ کی تمام زمینیں مال گزاری سے مستثنیٰ تھیں عیسائی پادری اپنی اقوام سے خود ٹیکس وصول کرتے تھے اور جو شخص اس کو ادا نہیں کرتا تھا اس کا نکاح تک نہیں پڑھایا جاتا تھا۔عیسائی اقوام فوجی خدمات سے بھی مستثنیٰ قرار دے دی گئی تھیں حالاں کہ جنگ بلقان میں ترکی موت وحیات کی شدید کشمکش میں مبتلا تھا مگر پھر بھی عیسائیوں پر اس جنگ کا بار نہیں ڈالا گیا۔جب کہ ۱۹۰۸ء میں عثمانوی خلافت دستوری حکومت میں تبدیل ہوگئی تھی۔

۱۸۔ البیراک،صادق، ۲۰۱۲ء،*Religious Struggle in Turkey*،انگریزی ترجمہ:محمد خان کیانی،انقلاب،استنبول،ص ۱۵،۱۶

۱۹۔ ایضاً،ص ۱۶

۲۰۔ یکم اکتوبر ۲۰۱۲ء،معارف فیچر،جلد نمبر ۵ شمارہ ۱۹،پندرہ روزہ،کراچی،ص ۴

۲۱۔ مودودی، ۱۹۲۲ء،ص ۲۸

۲۲۔ مودودی، ۱۹۲۱ء،سمرنا میں یونانی مظالم،دارالاشاعت مشرقیہ دہلی،ص ۲۳،۲۴

۲۳۔ ایضاً؛اس کتاب میں انجمن دفاع اسلام کی جانب سے نوٹ بھی موجود ہے۔انجمن دفاع اسلام لندن نے دارالعوام برطانیہ میں Herbert Aurbrey اور کمانڈر Kenworthy کے ذریعے تین سوالات پیش کیے تھے۔ان کا مجمل جواب

Harmsworth نے یہ دیا کہ سرکاری طور پر ان مظالم کی جن کا ذکر کیا گیا ہے تحقیق کی جائے گی اور اگر وہ ثابت ہو گئے تو اس کے متعلق ضرور کارروائی ہو گی۔ اس سرکاری اعلان اور شیخ الاسلام ترکی کے زبردست احتجاج کی وجہ سے ایک اتحادی کمیشن سمرنا بھیجا گیا مگر اس سے قبل اس کے کہ وہ اپنا کام شروع کرتا جنرل paroskevopouls سمرنا سے یونان بلا لیا گیا اور بعد میں کمیشن نے جن جن یونانی افسروں کو ملزم قرار دیا وہ اپنے عہدوں پر مامور رہے۔ انجمن دفاع اسلام سے ڈکسن جانسن، مارماڈیوک پکتھال، یعقوب حسن اصفہانی، مشیر حسین قدوائی وابستہ تھے۔ ڈکسن جانسن نے ترکوں کی امداد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے؛ ایم۔ اے شریف، ۲۰۱۱ء، Brave Hearts Pickthal and Philby two English Muslims in a changing World، اسلامک بک ٹرسٹ، کوالالمپور، ص ۲۸، ۲۹

۲۴۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، سید، جون ۱۹۳۹ء، تنقیحات، مکتبہ جماعت اسلامی، دارالاسلام، پٹھانکوٹ، پنجاب، ص ۶۸؛ انھوں نے اپنے ایک مضمون ترکی میں افراط و تفریط کا ہنگامہ میں لکھتے ہیں کہ: ''ترکی کی عام آبادی کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ وہ نہایت سخت مذہبی ہیں۔ خصوصاً مشرقی اناطولیہ کے باشندے تو اپنی مذہبیت کے اعتبار سے دنیا کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ راسخ العقیدہ ہیں۔۔۔ ایسی آبادی میں بیٹھ کر محض فوجی قوت کے بھروسے اس قسم کے انتہا پسندانہ اصلاحی خیالات کو عملی جامہ پہنانا جو مذہب اور مذہبیت سے بُعد تام رکھتے ہیں کسی عقل مند اور صاحب تدبر کا کام نہیں ہو سکتا۔ اس کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ عوام انتشار میں پڑ جائیں تفصیلات کے لیے دیکھیے: سید ابوالاعلیٰ، ستمبر ۲۰۱۶ء، صدائے رستاخیز، مرتبہ: خلیل احمد حامدی، ادارہ معارف اسلامی لاہور، ص ۶۴۰

۲۵۔ اردوگان، طیب، اکتوبر ۲۰۱۱ء، اسلاموفوبیا: انسانیت کے خلاف جرم، ترجمہ: محمد دین جوہر، مشمولہ: سہ ماہی 'جی'، لاہور، ص ۸۱

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، سید، جون ۱۹۳۹ء، ص ۷۱

۲۸۔ ۲۸ جنوری ۲۰۱۲ء، *The Economist London*، اردو ترجمہ: ''معارف فیچر''، کراچی، جلد نمبر: ۵ شمارہ نمبر ۴، پندرہ روزہ، ۱۶ فروری ۲۰۱۲ء، کراچی

۲۹۔ مودودی، ۱۰ نومبر ۱۹۵۱ء، ہمارے داخلی و خارجی مسائل، شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی، حلقہ سندھ، کراچی، ص ۸

۳۰۔ مودودی، ۱۹۴۲ء، مسئلہ قومیت، مکتبہ جماعت اسلامی، دارالاسلام، پٹھانکوٹ، پنجاب، ص ۹۰

۳۱۔ ایضاً، ص ۹۱

۳۲۔ ایضاً، ص ۹۲؛ مولانا مودودی نے الجمعیۃ ۱۳۴۳ھ کے اداریے میں ترکی کے عنوان سے ترکوں کی مغرب زدگی پر سخت تنقید کی اور کہا کہ: ''ترکی جدید کی تنظیم میں انتہا پسندی کے عناصر نے غلبہ حاصل کر لیا ہے اور نئے مدبرین سلطنت سے ترقی و تجدید کے جوش میں بعض ایسی حرکات سرزد ہو گئیں ہیں جن پر دنیائے اسلام میں ایک عام رنج و افسوس کی لہر دوڑ گئی ہے۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: مودودی، سید ابوالاعلیٰ، ستمبر ۲۰۱۶ء، صدائے رستاخیز، مرتبہ: خلیل احمد حامدی، ادارہ معارف اسلامی لاہور، ص ۴۰

۳۳۔ مودودی، اگست ۲۰۰۳ء، القدس پس منظر اور صیہونی عزائم، ادارہ معارف اسلامی، کراچی، ص ۱۶

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ سید مودودی نے ۱۹۲۴ء میں نگار میں جو نیاز فتح پوری نکالتے تھے اس میں مصطفیٰ کامل پاشا سرزمین فراعنہ کا بے مثل فرزند کے عنوان سے مصطفیٰ کامل پاشا کی زندگی پر ایک تفصیلی مضمون لکھا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۰ سے ۲۲ سال ہو گی۔ انھوں نے اس مضمون کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کو اس کی شخصیت سے اس لیے متعارف کروایا تا کہ ہندوستانی نوجوان بھی انگریزوں

سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اس کا طریقہ اختیار کریں۔اس ترجمے کی کہانی بھی دل چسپ ہے۔یہ ترجمہ پہلی بار نگار میں شائع ہوا تو اس میں نیاز فتح پوری نے بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بطور مترجم اپنا نام لکھا۔۱۷رفروری ۱۹۷۱ء میں انیس جیلانی کے نام خط میں سید مودودی لکھتے ہیں کہ: ''مصطفی کامل پاشا کی کتاب المسلہ الشرقیہ کا ترجمہ میں نے کیا تھا اور نیاز فتح پوری کو اشاعت کے لیے دیا تھا انھوں نے اس کو اپنے نام سے چھاپ دیا اور ترجمے کا معاوضہ تک نہ دیا''۔اسی طرح نیاز فتح پوری نے مولانا کے ایک مضمون جو انھوں نے ان معاشی نقصانات پر لکھے جو انگریزوں نے ہندوستان کو پہنچائے تھے وہ بھی انھوں نے اپنے نام سے شائع کر دیا تھا جس پر سید مودودی نے سخت احتجاج بھی کیا تب باقی کی دو قسطیں سید مودودی کے نام سے شائع ہوئیں۔مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے؛مصطفی کامل پاشا،ستمبر ۱۹۹۴ء،المسلة الشرقیہ،مترجم: سیدابوالاعلیٰ مودودی،ادارہ معارف اسلامی،لاہور

Abstract

Young Syed Abul Aala Mawdudu witnessed how the Ottoman Sultanate came to end. Since then he tried his best to inform the Muslim communities of the sub-continents and abroad what had happened to the Ottomans and inculcate the concept of umma in the hearts of his audiences. The Ottomans were criticized by the European countries and they started blame game. This article aims at explaining what Syed Mawdudi did by translating texts in order to provide a vivid picture to his audiences. Muhammad Ali Johar played an important role in the subcontinent to aware the Muslim communities about the atrocities of the European contraries. Mazameen-e Muhammad Ali (vol.I) compiled in recognition of Muhammad Ali Johar by Syed Muhammad Jafri has a forward which is a testimony of how Syed Mawdudi admired him. The article contains many relevant primary sources on its subject.

Keywords: Syed Abul Aala Muwdudi, Ottoman sultanate, Muhammad Ali Johar